

مغربی بنگال میں اردو افسانے کا ارتقاء (تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

A Research Review on the Evolution of Urdu Fiction in West Bengal

Dr. Waseem Abbas Gul

Received on: 06-01-2022

Accepted on: 08-02-2023

Abstract

Bengal has also played a special role in the evolution of Urdu language like other regions. As the education of Fort William College flourished in Bengal, Urdu prose flourished. But this does not prove that Urdu prose also originated from the time of Fort William College. On the contrary, current research indicates that Urdu prose existed even before . From 1800 to 1828 the activities of Fort William College continued with vigor. In this short period, Urdu prose developed a lot and gained an important place in Urdu literature. Mir Aman, Haider Bakhsh Haidari, Mazhar Ali Khan Villa, Beni Narayan, Nihal Chandra Hori, Mirza Ali Lutf, Mir Bahadur Ali Hussaini and other writers lifted Urdu prose from the floor and enthroned it in Bengal. This is the reason why in the latter half of the nineteenth century the Urdu language was able to express the modern trends, contemporary demands and problems of life with simplicity and ease, but unfortunately Lord Welsh and Sir John Gilchrist were disaffected and disturbed by the company. Had to resign. After these people left, the golden age of the college ended. If these people had stayed here for some time, the development and popularity of Urdu prose would have increased further. However, after the closure of the college on the order of Lord Dalhousie in 1854, the development of prose literature of Bengal was affected to a great extent, but what happened was that the Fort William movement gave Bengal the first place in the history of Urdu prose. In this connection, it is also worth mentioning that the first Urdu newspaper 'Jam Jahan Nama' was published from Bengal in 1822 under the editorship of Harihard. Camps were first established here. Science and arts books were authored, compiled and translated. The work of printing and publishing also started in relation to dictionary, rules, history, geography, science and medicine and thus the prose developed such a breadth and capacity that it started conveying every subject in common language. In the latter half of the 19th century, though the focus on prose literature waned, the light of the candle lit by the Fort William College spread from Bengal to the rest of the country. Under his influence, the Sir Syed movement gave more energy and scope to Urdu prose.

Keywords: Bengal, Urdu, Fiction, Fort William, College, etc.

موضوع پر گفتگو

مغربی بنگال میں اردو افسانے کے ضمن میں یہاں کی اردو نثر کی تاریخ پر نظر پڑتی ہے تو سب سے پہلے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس سے وابستہ مصنفین کے کارنامے سامنے آتے ہیں، چونکہ کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں عمل میں آیا تھا اس لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُنیسویں صدی کے آغاز سے بنگال میں اردو نثر کا بول بالا ہوا۔ لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اردو نثر کی ابتدا بھی فورٹ ولیم کالج کے زمانے

سہی ہوئی۔ بلکہ موجودہ تحقیق سے اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ۱۸۰۰ء سے قبل بھی اُردو نثر موجود تھی۔ اس بات کا اعتراف ڈاکٹر جاوید نہال نے بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اُنیسویں صدی سے کچھ قبل اُردو میں چند نثری کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ مزید فرماتے ہیں:

”اُنیسویں صدی سے چار سال قبل نواب عطا حسین خان تحسین نے ”نوطر زمر صغ“ لکھی جو قصہ چہار درویش فارسی کا پہلا اُردو ترجمہ ہے اور جو میرامن دہلوی کی مشہور عالم داستان ”باغ و بہار“ کا ماخذ اور منبع ہے۔“ نوطر زمر صغ“ اپنی گنجگاہ عبارتیں، ادق الفاظ اور برج بھاشا کی تراکیب سے بوجھل ہونے کے نتیجے میں مقبول اناں نہیں ہو پائی۔۔۔۔۔۔ ”حسن اختلاط“ کا سنہ تالیف ۱۷۹۶ء قرار پاتا ہے، لیکن ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد پروفیسر جان بروٹھوک گل کرسٹ کو نواب میر ابوالقاسم نے اُردو کی یہ پہلی نثری کتاب نذر کی۔۔۔۔۔۔ اس کی زبان بھدی، کھروری ہے، شگفتگی و تازگی سے عاری ہے جو اس کی نامقبولیت کی وجہ بنی۔۔۔۔۔۔ یہ داستان کے بجائے ایک مختصر تاریخی صحیفہ ہے جس میں ہندوستان کی مختلف حکومتوں اور سلطنتوں کا جیسے ہندو پٹھان و مغل اور انگریزی سلطنتوں کا حال نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔“ (۱)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۰۰ء سے قبل اردو کی کئی نثری تصانیف بنگال سے شائع ہو چکی تھیں مگر زبان و بیان کی ناہمواری کے سبب انہیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ جاوید نہال کے اس خیال کی تصدیق ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہو جاتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ہی بنگال میں اردو نثر کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وہ فرماتے ہیں:

”بنگال میں اُنیسویں صدی سے پہلے ہی اردو نثر کی ترقی کے اسباب پیدا ہو چکے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام یہیں تھا۔ اس کو اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہندستانی زبان کا سیکھنا سمجھنا اور بولنا انتہائی ضروری تھا۔ ضروری تھا۔ کمپنی کے ذمہ داروں کی دور اندیشی اور لسانی بصیرت کو یقین کامل ہو گیا تھا کہ ملک گیر پیمانے پر ہندوستانی (اردو) زبان ہی کو مقبولیت حاصل ہوتی جائے گی اور اس کا چلن اور استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا اس لیے انہوں نے انفرادی حیثیت سے ذاتی طور پر اردو سیکھنا شروع کر دیا اور اردو سیکھنے سے متعلق اردو کتابیں بھی۔ قواعد، انگریزی ہندستانی لغات لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اُنیسویں صدی کا آغاز بنگال میں اردو نثر کے لیے نہایت مفید اور مبارک ثابت ہوا ہے۔“

۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۸ء تک فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیاں زور و شور سے جاری رہیں۔ اس قلیل مدت میں اردو نثر نے کافی ترقی کی اور اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ میرامن، حیدر بخش حیدری، مظہر علی خان ولا، بنی نرائن، نہال چند لاہوری، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی اور دیگر ادیبوں نے بنگال میں اردو نثر کو فرش سے اٹھا کر عرش نشین کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو زبان جدید رجحانات، عصری تقاضوں اور زندگی کے مسائل کو سادگی اور آسانی کے ساتھ اظہار کرنے کے قابل ہوئی لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ لارڈ ویلیزلی اور سر جان گل کرسٹ کو کمپنی سے بدل اور پریشان ہو کر استعفیٰ دینا پڑا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد کالج کا سنہرا دور ختم ہوا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ اور یہاں رہے تو اردو نثر کی ترقی اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہوتا۔ بہر کیف ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈالہوزی کے حکم پر کالج کے بند

ہونے کے بعد بنگال کے نثری ادب کی ترقی بہت حد تک متاثر ہوئی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ فورٹ ولیم کی تحریک نے اردو نثر کی تاریخ میں بنگال کو مقام اولیت دلادیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بنگال ہی سے اردو کا پہلا اخبار ’جام جہاں نما‘ ۱۸۲۲ء میں ہری ہر دت کی زیر ادارت شائع ہوا۔ چھاپے خانے سب سے پہلے یہاں قائم ہوئے۔ علوم و فنون کی کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی گئیں۔ لغت، قواعد، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، طب کے سلسلے میں بھی طباعت و اشاعت کا کام شروع ہوا اور اس طرح نثر میں ایسی وسعت اور صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ ہر موضوع کی ترسیل عام فہم زبان میں کرنے لگی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں گرچہ نثری ادب کی طرف توجہ کم ہو گئی لیکن فورٹ ولیم کالج نے جو شمع روشن کر دی تھی اس کی روشنی بنگال سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس کے زیر اثر سرسید تحریک نے اردو نثر کو زیادہ توانائی اور وسعت عطا کی۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا بھی ضروری ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد کلکتہ کے مٹیا برج میں واجد علی شاہ کی جلا وطنی کا دور شروع ہوا اور یہ دوسرے اردو مرکز کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ عبدالحلیم شرکے والد تفضل حسین واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے انہوں نے شرر کو یہاں بلا لیا اور اس طرح کچھ عرصہ یہاں کی فضا میں شرر کی تربیت ہوئی۔ انہوں نے اس تہذیب کو قریب سے دیکھا جس کے زوال کی کہانی ان کے ناولوں میں کہیں کہیں ملتی ہے۔ شرر نے بنکم چندر چٹرجی کے مشہور ناول درگیش نندنی کا ۱۸۸۶ء میں اردو ترجمہ بھی کیا۔ واجد علی شاہ شاعر کے ساتھ ساتھ نثر نگار بھی تھے۔ بیگمات اودھ کے نام ان کے خطوط اور دوسری نثری تحریر میں اس کی شہادتیں ہیں۔

یہاں بردوان کے معروف ادیب حفیظ بردوانی کا ذکر ناگزیر ہے۔ وہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ نہیں تھے لیکن انہوں نے ۱۸۱۰ء میں ابوالفضل علامی کی مشہور کتاب ”عیار دانش“ کا اردو ترجمہ کیا جس کی اشاعت پہلی بار ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ اس میں عبرت آموز اور اصلاحی کہانیاں اور دلچسپ حکایتیں شامل ہیں یہ کتاب گرچہ فارسی سے ترجمہ ہوئی ہے لیکن اس میں آسان اور صاف ستھرا انداز بیان اپنایا گیا ہے۔ کہیں کہیں فارسی جیسی رنگینی در آئی ہے مگر اس کا استعمال کثرت سے نہیں ہوا ہے۔

انیسویں صدی میں مرشد آباد کے انشاء اللہ خاں انشا اور خندکار فضل رائل ربی کا ذکر آتا ہے۔ انشاء اللہ کی نثری کاوشوں میں تین تصانیف بہت اہم ہیں۔ دریائے لطافت، سلک گوہر اور رانی کینکلی اور کنور اودے بھان۔ ”دریائے لطافت“ پہلے فارسی میں ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی بعد ازاں مولوی عبدالحق نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۶ء شائع کیا اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اس کا اردو ترجمہ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی سے کرایا اور انجمن ترقی اردو ہند اور نگ آباد سے شائع کیا۔ اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ انشا کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ان کے دوست مرزا قتیل نے لکھا ہے اردو زبان و قواعد سے متعلق اس دور کی یہ ایک اہم کتاب ہے ”سلک گوہر“ بے نقط نثری داستان ملکہ گوہر اسکی ہیر و من ہے۔ اس میں آوازوں کی ہم آہنگی متاثر کرتی ہے۔ اس کہانی میں تین اہم کردار ہیں۔ ملک روس، ملکہ گوہر آر اور اس کی سہیلی گل رو۔ انشا کی اس کتاب کی دریافت کا سہرا مولانا امتیاز علی خان عرشی کے سر جاتا ہے انہوں نے اس کا مخطوطہ رضا لاہیری رام پور سے حاصل کیا اور ۱۹۴۵ء میں اسٹیٹ پریس رام پور سے شائع کیا۔ انشا کی سب سے اہم اور دلچسپ کتاب کا نام ”رانی کینکلی اور کنور اودے بھان“ ہے۔ یہ کہانی

فورٹ ولیم کالج کے عروج کے دور ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انشا کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ یہ کہانی روزمرہ زندگی کی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں یہ دوسری داستانوں کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ جیسا کہ نام سے عیاں ہے کہ یہ کنور اودے بھان اور رانی بیکئی کی عشقیہ داستان ہے۔ اس میں پہلے دونوں میں محبت ہوتی ہے۔ پھر شادی کے لیے دو خاندانوں میں لڑائی اور اس کے بعد دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے مختصر قصہ گوئی کی روایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اول ایڈیشن میں اس کی ضخامت صرف ۵۱ صفحے تھی۔ بقول ایم حبیب خان:

”۔۔۔ (انشا کی) اس کہانی نے مختصر قصہ گوئی کی روایت قائم کی اور اس میں ایسی کشش اور دل فریبی پیدا کی کہ یہ کہانی بڑے شوق سے پڑھی جانے لگی۔ انشا کی اس کہانی کا شمار اردو کی مشہور داستانوں میں ہوتا ہے۔ یہ کہانی اردو زبان میں ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے۔ اس کے باوجود کہانی کا پلاٹ جاندار اور مکمل ہے کہیں سے جھول نظر نہیں آتا۔ زبان آسان اور سلیس ہے اس میں ہندوستانی معاشرت اور سیرت کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں اس کی دریافت کا سہرا مسٹر کلنٹ پر نیپل لا مارٹن لکھنؤ کے سر ہے انہوں نے اس کو پہلی بار ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۵ء میں رسالہ ایشیائیک سوسائٹی آف بنگال میں شائع کرایا تھا لیکن اس وقت یہ بہت غلط چھپی تھی بعد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کی تصحیح کر کے باقاعدہ انجمن کے سہ ماہی رسالہ ”اردو“، اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد پہلی بار کتابی صورت میں ”داستان رانی بیکئی اور کنور اودے بھان“ کے نام سے انجمن کے مطبع اور ننگ آباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔“ ۳۰

مندرجہ بالا اقتباس سے مذکورہ کہانی کے متعلق تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ اس کہانی کی خصوصیت اور دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۷۱ء میں معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے کہانی رانی بیکئی اور سلک گوہر کو اپنے مفید مقدمے کے ساتھ ”انشا کی دو کہانیاں“ کے عنوان سے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا ہے۔

خندکار فضل ربی بنگالی ادیب تھے لیکن اردو میں انہوں نے ایک نادر کتاب تصنیف کی۔ جس کا نام ”حقیقتِ مسلمانانِ بنگالہ“ ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری دور کی یہ تصنیف انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں ڈاکٹر جاوید نہال فرماتے ہیں:

”۱۸۹۱ء میں ایک بنگالی ادیب خندکار فضل ربی اردو کے بھی نامور ادیب ہوئے جنہوں نے بے حد مفید اور اہم کتاب ”حقیقتِ مسلمانانِ بنگالہ“ تصنیف کی ہے۔ یہ تاریخی کتاب ہے جس میں ہندوستان بالخصوص بنگال کے شرفا مسلمان خاندانوں کے بڑے دل نشیں پیرائے میں قلمبند کیا گیا ہے۔ ”حقیقتِ مسلمانانِ بنگالہ“ اہم کتاب ہے اس میں بنگالی مسلم خاندانوں کی زبان، تہذیبی و ثقافتی زندگی، معاشرے اور آداب و اخلاق کی جیتی جاگتی تصاویر ملتی ہیں۔ اس کتاب کا حجم مختصر ہے۔ ۱۲۵ صفحات پر مشتمل چند کار فضل ربی کی یہ گراں قدر تصنیف ۱۸۸۱ء میں مکمل ہو چکی تھی مگر دس سال بعد ۱۸۹۱ء میں مطبع رئیس الاخبار مرشد آباد میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ خندکار فضل ربی سے بھی

زبان کی لغزشیں ہوئی ہیں بیان میں ناہمواری ہے اور بعض غلطیاں بھی دانستہ یا نادانستہ واقع ہو گئی ہیں۔۔۔۔۔“^{۳۴}

مندرجہ بالا اقتباس سے مذکورہ کتاب کی اہمیت و افادیت کا احساس ہوتا ہے علاوہ ازیں دیگر تفصیلات کا بھی علم ہوتا ہے۔ اقتباس کی آخری سطور میں جاوید نہال نے کتاب میں در آنے والی بعض لغزشوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُنیسویں صدی میں مرشد آباد سے شائع ہونے والی نثری کتابوں میں خندکار فضل ربی کی مذکورہ تصنیف اہمیت کی حامل ہے۔

علاوہ ازیں اس دور میں بعض دیگر قلم کاروں نے بھی اردو میں ابتدائی داستان، ناولیں اور اردو ڈرامے لکھے۔ بعض فن کاروں نے انگریزی اور بنگلہ سے ترجمے بھی کیے۔ یہاں بعض غیر مسلم بنگالی ادیبوں کا ذکر انتہائی ضروری ہے ان میں پر بھات چندر مکھرجی، ستیش چندر بوس اور کالی کرشن مکھرجی وغیرہ شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے اردو میں ناولوں کی روایت کو مضبوط کرنے میں کامیاب رول ادا کیا۔ ان قلم کاروں کی تحریر میں آج بھی اس دور کی تہذیب اور لوگوں کے حالات زندگی سے واقف کراتی ہیں۔ پروفیسر وحید اختر نے اپنے ایک مضمون میں اس دور کے دیگر ادیبوں کے ساتھ مندرجہ بالا قلم کاروں کا جمالی جائزہ لیتے ہوئے فرمایا ہے:

”اردو کے ابتدائی ناولوں میں پر بھات چندر مکھرجی کا ناول ”پولا“ بنگلہ کی منگل کتھا کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں نواب سید محمد آزاد کا طنزیہ مزاحیہ ناول ”سوانح عمری مولانا آزاد“ شائع ہونا شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ستیش چندر بوس کے کئی ناول شائع ہوئے۔ جیلہ (۱۹۰۷ء)، سلیمہ بیگم (۱۹۱۴ء)۔ خیال گلش یعنی فسانہ پدماتی (۱۹۱۵ء)، کالی کرشن مکھرجی کا ناول ”ولایتی“ ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ آزادی سے قبل کے ناول نگاروں میں بیگم مرزا احمد علی کا ناول ”ماہدر خشاں“ اس لحاظ سے وقعت کا حامل ہے کہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہونے والے اس ناول کا مقصد ہندوستانی مسلمان عورتوں کو اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات و روایات سے روشناس کرنا تھا۔“^{۳۵}

مندرجہ بالا اقتباس سے اس دور کے مذکورہ ادیبوں کی تصانیف کے نام اور سالی اشاعت کا پتہ بھی چلتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختلف النوع موضوعات کا علم بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ عوام کی ذہنی تسکین کے ساتھ معاشرے کے اصلاحی پہلو پر بھی ادیبوں کی نظر رہتی تھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے آخری دور میں بھی اردو افسانے کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ ہاں اردو ترجمے اور ناول نگاری کے میدان میں کچھ لوگ نمایاں نظر آتے ہیں جن کے متعلق سالک لکھنوی بھی پروفیسر وحید اختر کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”اُنیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں بنگال کے اردو ایوان نثر میں کچھ چراغ جل اٹھے اور تنقید و تحقیق، تذکرہ نویسی، سوانح نگاری، طنز و مزاح اور خطوط نویسی کی راہوں میں روشنی نظر آنے لگی۔ یہ وہ دور تھا جب عبدالغفور نساخ (۱۸۳۳ء-۱۸۸۹ء)، سید عصمت اللہ الخ (۱۸۳۷ء-۱۸۸۶ء)، سید عبدالغفور شہباز (۱۸۵۷ء-۱۹۰۸ء)، سید محمد آزاد (۱۸۴۹ء-۱۹۱۶ء)، حکیم حبیب الرحمن (۱۹۸۰ء-۱۹۴۷ء) جیسی عظیم المثال شخصیتیں افق نثر پر ابھریں اور پورے ادبی ماحول پر چھا گئیں۔۔۔۔۔ اگرچہ تذکرہ نگاری میں جناب نساخ سے قبل شری جنے جے متر ارامان اردو میں دو تذکرے ”تذکرہ دلکش“ اور ”منتخب التذکرہ“ لکھ چکے تھے تاہم جناب نساخ کا ”سخن الشعرا“ جس میں ولی دکنی

سے اپنے دور تک کے شعرائے کرام کا ذکر ہے تاریخ ادب میں مستند ٹھہرا۔^{۸۷} سالک لکھنوی صاحب اپنی مذکورہ کتاب میں اس دور کے بعض دیگر نثر نگاروں کی فہرست بھی پیش کرتے ہیں جیسے نخستہ اختر سہروردیہ، خواجہ عتیق اللہ شیدا، بدر الزماں بدر، نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی، خالد بنگالی وغیرہ۔ علامہ رضا علی وحشت کے مضامین کا ذکر بھی آیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ابوالکلام آزاد اور عبدالرزاق بلخ آبادی کی نثر نگاری کا بیان بھی تفصیل سے آیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہی وہ دور تھا جب بنگال میں اردو افسانوں کا خمیر تیار ہو رہا تھا اور ترجمہ کی شکل میں غیر ملکی کہانیاں اردو زبان میں منتقل ہو رہی تھیں۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا اور بنگال کی مٹی میں افسانے کسمانے لگے۔ دودھائیوں تک ترجمے کی روش قائم رہی مگر جلد ہی طبع زاد افسانے لکھنے کا دور شروع ہوا۔ ڈاکٹر عشرت بیٹاب کے مطابق:

”بنگال کی اولین افسانہ نگار راحت آرابنگم ہیں جن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”پریمی اور دیگر افسانے“ ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔“^{۸۸} لیکن ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنی مرتبہ کتاب ”راحت آرابنگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے“ کے صفحہ ۵ پر راحت آرا کا سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء لکھا^{۸۹} (جو درست لگتا ہے۔ سالک لکھنوی نے بھی تصدیق کی ہے کہ ”راحت آرابنگم ۱۹۱۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔“^{۹۰})

لہذا ڈاکٹر عشرت بیٹاب کے مندرجہ بالا قول سے انحراف کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہونے والی کسی ادیبہ کی کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہو جائے۔ کچھ آگے چل کر ل۔ احمد اکبر آبادی اور جوہر غازی پوری پر نظر پڑتی ہے۔ بنگال میں اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ان دونوں افسانہ نگاروں کا ذکر کئی اعتبار سے اہم اور قابل لحاظ ہے۔ ذیل میں دونوں افسانہ نگاروں کا ذکر مختصر آئیش خدمت ہے: ل۔ احمد اکبر آبادی ۸ اپریل ۱۸۸۵ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں پہلی بار کلکتہ تشریف لائے اور کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں یہاں سے چلے گئے دوسری بار ۱۹۴۹ء میں یہاں آئے اور ۱۹۷۹ء میں یہاں سے آگرہ چلے گئے۔^{۹۱} اور ۱۹۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح اپنی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال انہوں نے کلکتہ میں گزارے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ اچھے مترجم اور بہترین انشا پرداز تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے علمی و ادبی مضامین اور تنقیدی مقالات بھی لکھے۔ انہوں نے ’لالہ رخ‘ اور ’فرشتوں کی محبت‘ جیسے عمدہ ادبی شہ پاروں سے اردو دنیا کو سرفراز کیا۔ ان کے طبع زاد افسانوں کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ ’زندگی کے کھیل اور دن رات‘، ’صبح و شام‘، ’رنگ و بو‘ اور نشیب و فراز۔ انہوں نے اس دور میں اردو ادب کی خدمت کی جب اشاعت و طباعت کی اتنی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ کلکتہ ان کے بار احسان کو فراموش نہیں کر سکتا۔

جوہر غازی پوری ۱۹۰۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے لیکن غازی پور کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ میڈیکل کالج سے ایم بی ایچ (ہومیوپیتھک) کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا مستقل قیام مغربی بنگال کے ضلع ہوڑہ میں رہا۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں ہی اپنے آپ کو افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول بنالیا تھا۔^{۹۲} ان کے افسانوں کا مجموعہ ”باغیانہ افسانے“ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا جسے ہوڑہ کا پہلا افسانوی مجموعہ

گردانا جاتا ہے۔ انہوں نے ”سولہ آنہ“ اور ”عبرت“ جیسے ہفتہ وار رسالے جاری کیے۔ وہ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ ان کے افسانوں میں عورت کی بے وفائی اور سماج کے خلاف احتجاج کی زبردست گونج سنائی دیتی ہے وہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ راحت آرا بیگم 1910ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔^{۱۳۹} وہ ایک ممتاز افسانہ نگار اور کامیاب ادیبہ تھیں۔ انہوں نے افسانوں کے چھ مجموعے شائع کیے۔ ’انقلاب‘، ’شب کی پکار‘، ’بدو کی بیٹی‘، ’بانسری کی آواز‘، ’پری کی اور دیگر افسانے‘ اور ’دلنواز غنچہ‘۔ ان کے افسانوں میں پریم چند اور ان کے معاصرین کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے بہت سے افسانے ”تہذیب نسواں“ اور ”عصمت“ میں شائع ہوئے۔ انہوں نے بنگلہ زبان کے چند مشہور افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ رہنما نکتہ ٹیگور کا مشہور افسانہ ’ڈاک گھر‘ کا ترجمہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان چلی گئیں اور ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

عندلیب شادانی ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے ان کا اصلی وطن سنبھل ضلع مراد آباد یوپی تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا۔^{۱۴۰} انہیں تین حیثیتوں سے شہرت نصیب ہوئی۔ شاعر، افسانہ نگار اور ناقد۔ وہ پریم بھاری کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ ۱۹۳۴ء سے ’ساقی‘ میں انہوں نے ”سچی کہانیاں“ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کہانیاں غیر متوقع طور پر بہت مقبول ہوئیں۔ ہر افسانہ کسی نہ کسی حقیقی واقعے پر مبنی ہوتا تھا۔ یہ کہانیاں ”سچی کہانیاں“ کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں نیش ونوش (افسانوی مجموعہ) اور چھوٹا خدا (طویل افسانہ) میں بھی ان کی افسانہ نگاری کے جوہر کھلتے ہیں۔

اس طرح ۱۹۲۰ء تک پیدا ہونے والے افسانہ نگاروں کی فہرست میں کچھ مزید نام شامل کیے جاسکتے ہیں جن میں محمد سلیمان واصف (۱۹۰۴ء)، جمیل مظہری (۱۹۰۵ء)، قیس شیخ پوری (۱۹۰۹ء)، صغریٰ سبزواری (۱۹۱۳ء)، حسن نجمی سکندر پوری (۱۹۱۳ء)، سالک لکھنوی (۱۹۱۳ء) اور شمین مظفر پوری (۱۹۲۰ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نمایاں افسانہ نگاروں میں شمین مظفر پوری سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔

محمد سلیمان واصف ۱۹۰۴ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔^{۱۴۱} وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ علامہ وحشت سے وابستہ ہوئے تو اشعار کہنے لگے۔ آغا حشر کاشمیری سے رشتہ استوار ہوا تو ڈرامہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ڈراموں کو اسٹیج کرتے وقت ہدایت بھی دی۔ بعد ازاں ل۔ احمد اکبر آبادی کا قرب حاصل ہوا تو افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ ان کے بعض افسانے رسالہ ”عالم گیر“ لاہور میں شائع ہوئے۔ ”شملہ سے عشق“ اور ”آدم“ ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ”تشمیر محبت“ کے نام سے ان کا ایک ناول بھی کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے۔

جمیل مظہری ۱۹۰۵ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں اپنے والد کے ساتھ کھلتے چلے آئے اور ۱۹۲۸ء میں بنگا باشی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔^{۱۴۲} وہ ایک کامیاب شاعر تو تھے ہی طنز و مزاح نگار بھی تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ثابت ہوئے۔ ان کے افسانوں میں عام طور پر طنزیہ رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے جاسوسی ناول بھی لکھے ہیں۔ جیسے گناہ کی دو سیٹیاں، دلچسپ غلطی، تخیل کی

صورت گری، اور ’انوکھا انتقام‘ وغیرہ۔ طویل افسانہ ”شکست و فتح“ میں بھی ان کا اسلوب دل کو چھوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں وہ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

صغریٰ سبزواری، مہدی سبزواری کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۹۱۳ء میں کلکتے میں پیدا ہوئیں۔^{۱۶۴} والدین نے گھر پر تعلیم دلائی، پرائیوٹ سے آئی اے کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد ہی پروفیسر طاہر رضوی سے ان کی شادی ہو گئی۔ صغریٰ سبزواری نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی تصنیف کیے۔ وہ علامہ راشد الخیری کے مشہور رسالہ ”عصمت“ کی مستقل مصنفہ تھیں۔ انہوں نے ٹیگور، بنکم چندری کی علاوہ دوسرے مصنفین کے افسانوں کا ترجمہ بھی کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ترجمہ نگاری کا شوق اس قدر بڑھا کہ رامائن اور مہابھارت کے ترجمے بھی کر ڈالے۔

’نور تن‘ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ناولوں میں ’خواب و بیداری‘، ’گمنام ہم سفر‘ اور ’موت کا سایہ‘ قابل ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ انہوں نے ’فارسی آموز‘ کے ساتھ ساتھ ہماری ’تاریخی حکایتیں‘ اور ’قومی قصے‘ نامی دو کتابیں بھی ترتیب دیں۔ صغریٰ سبزواری مغربی بنگال کے افسانوی ادب میں راحت آرائیگم کے ساتھ ساتھ چلنے والی فعال ادیبہ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔

حسن نجی سکندری پوری یکم نومبر ۱۹۱۳ء میں سکندر پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ریلوے کی ملازمت میں آئے تو تبادلہ کے سبب ۱۹۳۸ء میں کھڑ گپور میں ان کی تقرری ہوئی۔ شاعری شہرت کا سبب بنی لیکن نثر میں بھی کمال حاصل تھا۔ اپنے دور کے افسانہ نگاروں میں مقبول رہے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کی رمت ملتی ہے۔ وہ ایک دردمند انسان تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ’قلی‘ ۱۹۳۸ء میں روزانہ ہند کلکتہ میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”موم کی عورت“ اردو ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔

یہاں سالک لکھنوی کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ ان کی پیدائش ۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ ابتدا میں افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ بعد ازاں شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ طنزیہ مضامین بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’عذرا اور دیگر افسانے‘ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ موپاساں اور کالیرج کے افسانوں کے تراجم بھی شائع کیے۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقات میں اشتراکیت کا رنگ نمایاں ہے۔ دورِ حاضر میں وہ ایک معروف شاعر کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ’کلام‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ”مغربی بنگال میں اردو نثر“ کے نام سے ان کی تحقیقی کاوش بھی منظر عام پر آچکی ہے۔

شبین مظفر پوری نے ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھے۔ بعد ازاں غور و فکر کا دائرہ مزید وسیع ہوا۔ ان کا اصلی نام ولی الرحمن تھا، پیدائش سینماڑھی کے مقام پر ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ نویں جماعت سے ہی انہوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن باقاعدگی سے یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء سے جاری ہوا۔ آغاز میں مکالماتی کہانیاں لکھیں بعد ازاں بیانیہ کی طرف راغب ہوئے۔ رسالہ ”عبرت“ میں ان کی کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ وہ صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے لیکن کہانیاں لکھنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ”لڑکی جو ان ہو گئی“، ”کڑوے گھونٹ“، ”دکھتی رگیں“، ”دوسری بدنامی“ اور ”حلالہ“ وغیرہ۔ وہ خوبصورت اسلوب والے

ایک بالغ نظر افسانہ نگار تھے۔ ’حلالہ‘ ان کا انتہائی کامیاب افسانہ ہے جس میں انہوں نے معاشرے کے ایک نازک مسئلے کے ساتھ شریعت کے ایک اہم اصول کی طرف انتہائی محتاط طریقہ سے اشارہ کیا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو جس قدر اذیت سے دوچار کرتا ہے اسی قدر عبرت کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔ اسی طرح ’لڑکی جو ان ہو گئی‘ میں انہوں نے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے جہاں غریب اور مجبور باپ، بیٹی کی شادی کے غم میں دھیرے دھیرے موت کے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور بیٹی اسے موت سے نجات دلانے کے لیے کسی غلط راستے کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ اردو ادب پر شین مظفر پوری کے بڑے احسانات ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ مخصوص اسلوب اور خوبصورت زبان و بیان کے سبب اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں اور کامیاب نظر آتے ہیں۔

قیس شیخ پوری (۱۹۰۹ء- شیخ پورہ، موناگیر) کا اصل نام غلام رسول تھا اس لیے وہ جی آر تیں شیخ پوری کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔^{۱۸۷} ان کے افسانوں پر ترقی پسندی کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن کلی طور پر انہوں نے اسے نہیں اپنایا۔ ان کے افسانے میں ’انتظار کی گھڑیاں‘ اور ’تلخی‘ کافی مقبول ہوئے۔ آخری الذکر افسانے میں ایک مرد کی بے وفائی سے ایک دو شیرہ کا گاؤں سے طوائف کے کوٹھے تک پہنچ جانے کا بیان ملتا ہے یہ قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتا بھی ہے اور عبرت کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔

سہیل واسطی (۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء، آسنسول)^{۱۸۸} کے افسانے آج کے عہد کے ترجمان ہیں۔ ان کی تحریروں میں صفائی و سلاست ہے، طنز اور کاٹ بھی ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں اور اس کے انتشار کا گہرائی سے مطالعہ کر کے قاری کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ طنز کی دھار تہہ در تہہ اسے کاٹی چلی جاتی ہے اور قاری کو پانی تک مانگنے کی مہلت نہیں ملتی ہے۔ سموک اسکرین، شانتی پیدا ہوئی، اس کی روشن مثالیں ہیں۔ ’رنگوں میں گھر آدمی‘ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں کہیں کہیں علامتی رنگ کے نیچے چھپی ہوئی کھردری اور احتجاجی سطح نظر آرہی جاتی ہے۔ ان کے افسانے ’پیش بٹن‘ اور ’پلگ‘ میں بھی انسان کی بے بسی، بیزاری اور احتجاج کی لے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سہیل واسطی کے یہاں ایک سیاسی شعور ہے لیکن ان کا سیاسی شعور دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں سے جدا ہے وہ اقتدار اور دولت کا ذکر تو کرتے ہیں مگر ان کے یہاں جرأت اظہار میں ندرت اور راست احتجاج کی کاوش قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یونس احمد کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسندی کی ترجمانی کی ہے۔ ترجمہ نگاری کا بھی شوق رہا ہے۔ انہوں نے قاضی نذر الاسلام کے بنگلہ افسانوں کا ترجمہ ’طغیانی‘ کے نام سے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ ان کے طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ’سنگ ریزے‘ کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ان کی تحریروں میں حالات کے جبر سے نجات حاصل کرنے کی خواہش نظر آتی ہے۔ وہ انفرادی احتجاج کے قائل ہیں۔ ان کے احتجاج میں لکنت ہے نہ ہچکچاہٹ۔ بلکہ ان کے یہاں رعب، دبدبہ اور طمطراق نظر آتا ہے۔ ان کا افسانہ ’سنگ ریزے‘ اس کی خوبصورت مثال ہے۔

اسی دور میں پروفیسر شاہ مقبول احمد کی تحریروں بھی منظر عام پر آئیں۔ انہوں نے کئی عمدہ افسانے لکھے۔ خصوصاً ’تبدیلی‘ اور ’زیور‘ وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ ان کی کتاب ’پانچ افسانے اور انشائیہ‘ مطالعے کی شے ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات ڈھل

کر آئے ہیں جن میں شاہ مقبول کے گہرے مشاہدات اور تجربات کا عکس نمایاں ہے۔ ان کے یہاں زبان و بیان کی پختگی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ابتدا میں ان کا جھکاؤ ترقی پسند تحریک کی جانب تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں انفرادی مسائل کا حل معاشرتی تبدیلیوں میں نظر آتا ہے۔ اپنے دور کے وہ ایک کامیاب افسانہ نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کی نگارشات میں تحقیق و تنقید، طنز نگاری و انشائیے شامل ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں رئیس الدین فریدی کا نام آتا ہے جنہوں نے صحافت کو اپنا پیشہ تصور کیا لیکن افسانے بھی قلم بند کیے۔ اخبار ’خلافت‘ کے خاص نمبروں میں اکثر ان کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں کارواں، منزل، نظام ویلکی، مصور اور ایوان میں بھی ان کے افسانے طبع ہوا کرتے تھے۔ وفاراشدی کی اہم تالیف ”بنگال میں اردو“ ہے لیکن انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری اور افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ’ماں کی ممتا‘ کے نام سے ۱۹۳۹ء میں ماہنامہ ’فطرت‘ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے چند افسانے ہندستان کے دیگر رسائل میں بھی شائع ہوئے۔

صالح بیگم مخفی معروف افسانہ نگار جو ہر غازی پوری کی اہلیہ تھیں۔ انہوں نے کئی عمدہ افسانے لکھے۔ ان کا اولین افسانہ ’ل کا لچھا‘ کے نام سے ’عبرت‘ ہوڑہ میں شائع ہوا۔ یہی افسانہ بعد ازاں زیب النساء لاہور میں بھی شائع ہوا۔ ان کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ’نیا شاہکار‘ کے نام سے چھپ کر کافی مقبول ہوا۔ ان کی تحریروں میں روانی اور دلکشی ہے قاری ایسی رواں دواں نثر میں بہتا چلا جاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں بنگال کی افسانہ نگاری میں جس قدر تیزی آئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس اس میں مزید تیزی پیدا ہو گئی۔ شہزاد منظر نے شروع میں رومانی افسانے لکھے بعد ازاں ترقی پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ شام ہار کپوری نے دو افسانوی مجموعے ترتیب دیے۔ جن کے نام ”پدما کی موجیں“ اور ”میگھنا کی لہریں“ ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کی اشاعت کے بعد ان کا ایک ناول ”کرشنا چوڑا کے سائے میں“ بھی شائع ہوا۔ اس ناول میں فلیش بیک کے سہارے بنگال کی زندگی، تہذیب، سیاسی حالات اور انسانی معاملات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

جاوید نہال کے افسانوں کا مجموعہ ”پھول رانی“ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ انہوں نے روایتی افسانوں کے علاوہ تجریدی اور علامتی افسانے بھی سپرد قلم کیے اور جدید افسانہ نگاروں کی طرح کامیابی بھی حاصل کی۔ اس قبیل کے افسانوں میں سمندر بہریں مچھلیاں، نیم کارس، نیلے پیلے اور اداس بدن قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں میں زبان و بیان پر اچھی گرفت نظر آتی ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بھی کئی خوبصورت افسانے قلم بند کیے۔ ان کا افسانوی رنگ بیان روایتی تھا۔ انہوں نے افسانوں کے دو مجموعے ’راہ کا کاٹنا‘ اور ’شاعر کی شادی‘ شائع کیے لیکن بہت جلد یہ دونوں افسانہ نگار تحقیق کی جانب متوجہ ہو گئے۔

بعد ازاں اسحاق امرتسری (شاہکار افسانے)، علی افسر (بیتے آنسو)، شائستہ اختر (کوشش ناتمام)، جرم محمد آبادی (دس ہزار کانوٹ، انجان رشتہ، ٹائم ہیں، کھانسی) وغیرہ نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ نشاط الایمان، شمس صابری، قیصر شمیم اور عبدالمتمین نے بھی کئی بہترین افسانے سپرد قلم کیے۔ نشاط الایمان ۱۹۲۸ء میں ضلع ویشالی، بہار میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۴ء سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ’لیل ونہار‘ کے نام سے ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ’اوس اور آگ‘ بھی

شائع ہو گیا۔ مغربی بنگال کے اردو افسانہ نگاروں میں وہ ایک باوقار اور معتبر قلم کار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ادبی رجحان ترقی پسندانہ رہا ہے۔ سماج کا مشاہدہ بھی گہرا ہے۔ وہ نئے میلان اور رجحان کے مخالف نہیں ہیں۔ ”بابا کا تابوت“ علامت نگاری کی خوبصورت مثال ہے۔ انہوں نے افسانوں میں پیچ در پیچ مسائل کو پیش کیا۔ ان کا لہجہ عام ترقی پسند ادیبوں سے قدرے جدا نظر آتا ہے۔ شمس صابری (۱۹۳۰ء، ۱۹۶۰ء) ترقی پسند تحریک سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’دھند اور کرن‘ ۱۹۷۳ء میں قیصر شمیم نے رائٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام شائع کیا۔ جسے کافی مقبولیت نصیب ہوئی۔ افسوس کہ شمس صابری کو اجل نے بے وقت نگل لیا۔ ’دھند اور کرن‘ میں شامل افسانوں کا مطالعہ ان کی زبان و بیان پر دسترس اور فن افسانہ نگاری سے کماحقہ واقفیت کا احساس دلاتا ہے۔ ان کے افسانے ترقی پسند ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شمس ندیم (۱۹۳۳ء مولگیر) ایک باشعور افسانہ نگار تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ’بھولی بھالی‘ کے عنوان سے شمع میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں شب خون، شاعر اور بیسویں صدی میں بھی ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ مزدوروں کے مسائل سے متعلق ان کا افسانہ ’سونامکھی‘ حقیقت پسندی کا ترجمان ہے۔ زندگی اور موت کے موضوع پر مبنی افسانہ ’قیدی‘ اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعد کے دنوں میں وہ علامت پسندی کی طرف مائل ہوئے اور کئی بہت خوبصورت افسانوں سے اردو ادب کو مال مال کیا جن میں ’سرخ عورت نیلا گھوڑا‘ قابل ذکر ہے جس میں سماجی حقائق کو تحریری پیرایہ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ افسانہ ’آکٹوپس‘ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ جدیدیت کی ڈگر پر گامزن رہنے والے شمس ندیم نے ترقی پسندی کو بھی بھی شجر ممنوعہ تصور نہیں کیا۔

قیصر شمیم ۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو انگس، ضلع ہگلی، مغربی بنگال میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے لیکن شہرت بحیثیت شاعر نصیب ہوئی۔ ادبی زندگی کے آغاز میں عمید انگس کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ’وہ لڑکی‘ دہلی ہفتہ وار ’پارس‘ میں ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں جب انہوں نے اپنا نام قیصر شمیم رکھ لیا تو اس نام سے ان کا مشہور افسانہ ”بر“ ماہنامہ ’صبح نو‘ پٹنہ میں شائع ہوا۔ ان کے صرف چند ابتدائی افسانے رومانی نوعیت کے تھے لیکن بعد میں انہوں نے جتنے افسانے لکھے وہ سب کسی نہ کسی معاشرتی یا نفسیاتی موضوع سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ ذہنی میلان ترقی پسندی کی جانب تھا لیکن کسی نظریے کی پابندی کو انہوں نے اپنا شیوہ نہیں بنایا، بعد ازاں شاعری کی طرف توجہ خاص ہوئی۔ اچھی تنقید نگاری پر دسترس رکھتے ہیں، ترجمہ نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ پیاری نثر بھی لکھتے ہیں۔ افسوس کہ شاعری ان پر ایسی غالب آئی کہ وہ صرف اسی کے ہو کر رہ گئے اور گزشتہ کئی برسوں سے ان کا کوئی افسانہ منظر عام پر نہیں آیا۔ کبھی کبھی ان کے تنقیدی مضامین رسائل و جرائد میں نظر آتے ہیں۔

سعید پریمی اور عابد ضمیر ایک ہی دور اور تقریباً ایک ہی مزاج کے افسانہ نگار ہیں۔ دونوں قلم کار زبان و بیان پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ سعید پریمی ۲۴ فروری ۱۹۲۷ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ پہلا افسانہ اسی سال روزنامہ آزاد ہند کلکتہ (اجالا ایڈیشن) میں

بعنوان ’بد چلن‘ شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۶۰ء سے باقاعدگی سے نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری ہوا۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ سیاسی میدان میں بھی اپنی سرگرمیوں سے لوگوں کو متوجہ کیا اور کلکتہ کارپوریشن کے میٹران کا و نسل منتخب ہوئے۔ شعر گوئی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں مگر ان کی صلاحیتیں افسانہ نگاری کے میدان میں زیادہ کھل کر اجاگر ہوئیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی رہی اور بنگال کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں شامل ہوئے مخصوص افسانوی اسلوب کے مالک ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ ۱۹۸۲ء میں ’چہرے کی واپسی‘ کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں احتجاج، بغاوت اور بے اطمینانی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

عابد ضمیر ۱۸ جولائی ۱۹۳۷ء کو آسنسول میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں پہلا افسانہ ’تلخیاں‘ فلم ویکی کلکتہ میں شائع ہوا۔ تب سے باقاعدگی کے ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں اور تاحال اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ابتدائی افسانوں پر رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ حقیقت نگاری کی طرف جھکاؤ بڑھنے لگا۔ ”ڈوبتے سورج کا کرب“ (۱۹۸۱ء) ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ دوسرا مجموعہ ”دل کی تحریر“ (۱۹۹۱ء) بھی لائق مطالعہ ہے۔ تیسرا مجموعہ ”خطر خج کے مہرے“ کے نام سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۳ء میں ان کا چوتھا مجموعہ ”بھگی پلکیں“ منظر عام پر آچکا ہے۔ علاوہ ازیں ۲۰۰۰ء میں انہوں نے بچوں کی کہانیاں ”دو پھول“ کے نام سے شائع کی ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پھر نسیم انہو نوئی پڑا کٹریٹ کی سند حاصل کر چکے ہیں، تاحال درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

مغربی بنگال کے اردو افسانوی ادب میں عبد المتین کا نام بھی کسی قدر کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ وہ ۱۹۳۸ء میں گیا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء سے ان کی تحریر میں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی دور بہار کے ضلع گیا میں گزرا۔ بعد ازاں مغربی بنگال کے شہر آسنسول میں آکر سکونت اختیار کی اور زندگی کا ایک لمبا عرصہ یہاں گزارا۔ شروع میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے لیکن جلد ہی گھٹن کا احساس ہونے لگا اور جدیدیت کی طرف مائل ہو گئے۔ بعض افسانوں میں تحلیل نفسی کی طرف جھکاؤ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایسا ہوا، جبلت وغیرہ میں کہیں جنسی جس کا ماحول اور کہیں چھن نظر آتی ہے کہیں منٹو کی طرح بے باکی بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ ان کے علامتی افسانوں میں ابہام کم اور کھلا پن مقابلتاً زیادہ ہے۔ سمندر کا آئینہ، چٹان اور تعاقب وغیرہ ان کے خوبصورت علامتی افسانے ہیں۔ جن میں معنی کی کئی سطحیں نظر آتی ہیں۔ معاشرے کا مطالعہ گہرا اور شدید معلوم ہوتا ہے۔ وہ ژولیدہ بیانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں نئے نئے موضوعات اور واقعات کو چھان پھٹک کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں تین نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ظفر اوگانوی، فیروز عابد اور انیس رفیع۔ اس مثلث کے ذکر کے بغیر مغربی بنگال میں اردو افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ظفر اوگانوی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن استھوا و ضلع نالندہ (بہار) تھا، لہذا تعلیمی سرگرمیاں بہار میں طے کیں۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی اور وہیں سے ڈاکٹر اختر اورینو کی نگرانی میں صفیر بلگرامی پر ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ بعد ازاں کلکتہ آکر ۱۹۶۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر مقرر

ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں کالج سروس کمیشن کے ممبر اور کچھ عرصے بعد اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ بد قسمتی سے ۲۱ جون ۱۹۹۲ء میں کینسر کے مہلک مرض نے انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ انہوں نے اردو افسانوں میں نئی تکنیک، نیا اسلوب اور نیا سلیقہ اظہار اپنایا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ تحقیق و تنقید میں بھی دخل رہا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”بیچ کا ورق“ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ جدید دور کے علامتی اور تجریدی افسانوں کا مجموعہ ہے اس لیے نظریاتی طور پر ظفر اوگانوی کو جدیدیت پسند ادب کا نمائندہ افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔

فیروز عابد ۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کے دن کلکتے میں پیدا ہوئے۔ وہ مغربی بنگال کے جدید افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ عصری زندگی کے کرب کو نت نئی علامتوں سے زندہ و تابندہ کر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ”جیو تو جینے دو“ ۱۹۶۲ء میں رسالہ ”صبح نو“ میں شائع ہوا۔ تاحال ان کے تین افسانوی مجموعے ”اندھی گلی میں صبح“ (۱۹۸۱ء)، ”نقش برآب“ (۱۹۸۴ء) اور ”کھلے آسمان کے نیچے“ (۱۹۹۵ء) شائع ہو کر عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں احتجاج کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جدید رنگ کا ان کا پہلا افسانہ ”شب خون“ میں ”دبلیز کا محول“ کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں جدیدیت کا رنگ گہرا ہے مگر انہوں نے افسانوں کو چیتا بنے نہیں دیا ہے۔ اکثر مکالماتی انداز میں کبھی اپنے آپ سے، کبھی قاری سے گفتگو کرتے ہوئے افسانہ مکمل کر لیتے ہیں۔ وہ حکومت ہند سے ”قومی استاد“ کی سند بھی حاصل کر چکے ہیں۔

ظفر اوگانوی اور فیروز عابد کے بعد مثلث کے تیسرے ضلع یعنی انیس رفیع کا ذکر ہو جائے۔ یہ دنیائے اردو میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۶۲ء میں ”ہیر و نہیل پہ دہلا“ پائل ویلی بمبئی میں شائع ہوا۔ ”اب وہ اترنے والا ہے“ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ پھر ایک لمبے عرصے کے بعد ۲۰۰۳ء میں دوسرا مجموعہ ”کرفیو سخت ہے“ کے نام سے منظر عام پر آیا۔ پہلے مجموعے سے دوسرے تک سفر کرتے کرتے انیس رفیع کی افسانہ نگاری میں کئی نشیب و فراز آئے۔ پہلے جدیدیت کا رنگ زیادہ گہرا تھا ادھر علامتوں اور تمثیلوں میں کمی آئی ہے لیکن زبان و بیان کی شگفتگی ان کے افسانوں کی جان تھی سو آج بھی قائم ہے۔ کاٹھ کے پتلے، پولی تھین کی دیوار، اب وہ اترنے والا ہے، سات گھڑے پانیوں والی عورت وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے ”کرفیو سخت ہے“ میں شامل افسانے ان کی فکری پرواز اور فلسفیانہ رویوں کے مظہر ہیں۔ زبان و بیان میں اردو کے ساتھ انگریزی اور ہندی کے الفاظ کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ غراہت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے افسانے مجموعی طور پر اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔

مغربی بنگال میں اردو افسانہ نگاری کی روایت میں اضافہ کرنے والے بعض ایسے ادیبوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کے مجموعے دستیاب نہیں ہو سکے۔ بعض افسانہ نگاروں نے مجموعے کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان میں سجاد نظر، اقبال کرشن (رسہ کا تماشا)، امرامیری (تلاش)، وہاب پردیشی (شیشے کی دیوار)، الیاس قریشی (سایہ)، تسکین انصاری (دستک)، ناشر بلیاوی (دیوتا، ابھرتے سورج)، ساگر چاند انوی (بوجھ)، رئیس احمد جعفری (چنڈال)، الیاس نوناروی (آئندہ مٹھ کی روشنی)، مرزا ظہیر بیگ (تو کیا ہوتا)، نعیم اشفاق (نصف دائرے کا نوحہ)، مشتاق درانی (تاریک لمحے)، احسان ثاقب (فرشتہ)، محمود لیسین (سایگی)، انور خورشید (پرایا چاند)، انجم عظیم آبادی (سائیڈ ہیرو) اور احمد سلیم (

سکوت کی صدا کے علاوہ نصرت جمیل، شبنم کریمی، کمال احمد (ڈر-ٹرسٹ)، ایم علی، نور بھارتی اور نور اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ اظہار الاسلام کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور علامتی دونوں رویے نظر آتے ہیں۔ علامتی افسانوں میں دھیمے لہجے میں احتجاج ابھرتا ہے ان کے افسانوں میں طنز کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ 'شب خون'، 'الہ آباد میں اکثر و بیشتر چھپتے رہتے ہیں' کہیں کہیں افسانوں میں ابہام کا عنصر گہرا ہو جاتا ہے۔ اقبال کرشن کے افسانوں میں بھی یہی رویہ نظر آتا ہے۔ وہ جدیدیت کی دھن میں اکثر بہت دور دور نکل جاتے ہیں اور قاری بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ سجاد نظر کے زیادہ تر افسانے 'نفوش' (لاہور)، افکار (کراچی)، معیار (بھوپال) اور صبح نو (پٹنہ) میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک ناول رادھارانی کے نام سے شائع ہوا مگر ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ اب تک منظر عام پر نہیں آسکا۔ صدیق عالم کے ابتدائی افسانوں کا مجموعہ 'آخری چھاؤں' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ان کے یہاں علامت نگاری کا رجحان زیادہ ہے۔ وہ کہیں قومی کہیں بین الاقوامی صورت حال کو افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ مٹی فروش، مینار کے نیچے بیٹھا آدمی اور چور دروازہ وغیرہ ان کے ابتدائی دور کے افسانے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا ایک ناول 'چار نک کی کشتی' شائع ہوا ہے۔ وہ نظمیں بھی کہتے ہیں۔ ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے بہترین ڈراموں میں 'کبڑا بچہ'، 'جیک اینڈ جیل'، 'چار کہار' اور 'کائنات ایک خود کار مشین' مشہور ہیں۔ آسنسول کے افسانہ نگار ضیاء الرحمن ضیاء کے افسانوں کا مجموعہ 'فصلیوں کا قیدی' کے نام سے ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں شامل افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں لکھنے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ زبان و بیان میں بھی ایک معیار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مغربی بنگال میں آٹھویں دہائی میں خواتین افسانہ نگاروں میں دو نام بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں، روجی قاضی اور شہیرہ مسرور۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں افسانہ نگاروں کی تحریروں میں موضوعات اور ان کے ٹریٹمنٹ کا انداز جدا گانہ ہے۔ روجی قاضی کو ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ والد شعر کہا کرتے تھے۔ انہیں سن سن کر روجی کے دل میں کہانیاں لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پہلے چھپنے سے احتراز کرتی رہیں لیکن والد کے اصرار پر ایک بار اپنی کہانی 'خاتون مشرق' دہلی کو بھیج دی۔ مدیر عبداللہ فاروقی نے خوب پذیرائی کی اور اس طرح روجی افسانہ نگاری کی ڈگری پر باقاعدگی سے چل پڑیں۔ ان کی کہانیوں میں خصوصی طور پر تعلیم نسواں پر زور اور بے وفامردوں کے خلاف غم و غصہ نظر آتا ہے۔ 'سلگتی چاندنی' اور 'نئی کہانی' کے نام سے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'وفا کی ڈور' اور 'شام غم' کے نام سے دو ناول اور 'آج کی بیٹی کل کی ماں' کے نام سے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

شہیرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ 'سفر سے واپسی' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں معاشرے میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بے جا رسم و رواج کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے ان کا قلم مرد اساس معاشرے کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔ سفر سے واپسی، آگ بجھی ہوئی نہ جان، بازگشت وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ شہیرہ مسرور قلم سے نشر کا کام لینا خوب جانتی ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ راہ میں بگولے بھی اٹھتے ہیں۔ آنکھوں میں سوز بھی ہوتی ہے مگر ان تمام حالات سے قاری دور چار ہوتا ہے اور وہ اس کے بازو میں کھڑی مسکراتی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی علامتی طرز بیان استعمال کرتی ہیں۔ لیکن کہانی کو چیتا نہیں

بنے دیتی ہیں۔ قاری تھوڑی جستجو سے تحریروں میں اتر کر معنی کی تہہ کو جالیتا ہے۔ جدیدیت سے متاثر شہیرہ مسرور کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں معنی کی زیریں لہریں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ شہیرہ کے اندر موجود ایک طاقتور عورت کا احساس دلاتا ہے ادھر لیڈی براہورن کالج کی ڈاکٹر شاہین سلطانہ کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، جو خواص و عوام کو اپنی طرف مائل کرنے اور چونکانے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

نذیر احمد یوسفی کے افسانوں کا مجموعہ ”چپ فضا میں عذاب“ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے یہاں موجود عصری کرب کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اپنے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ ”ان کا ادبی سفر ۱۹۵۷ء میں شروع ہوا۔ پہلا افسانہ ’دل کا جنازہ‘ روزنامہ کلکتہ میں چھپا اس کے بعد چھوٹی بڑی یا اچھی بری جتنی بھی نت نئی تخلیقی کاوشیں افسانے کی صورت میں ابھریں وہ ہندستان کے مختلف ادبی، نیم ادبی اور غیر ادبی رسائل و جرائد میں صفحہ بدوش ہوئیں۔“^{۲۰} ”چپ فضا میں عذاب“ میں شامل افسانوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نذیر احمد یوسفی افسانہ لکھتے وقت پیچیدہ اور نامانوس الفاظ کی شعبہ بازی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت نگاری کو بہترین وسیلہ اظہار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ”تلفن“ ان کا بہترین افسانہ ہے جس میں فساد کا ماحول اور اس میں تار تار ہوتی ہوئی انسانیت کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ ”چپ فضا میں عذاب“ اور ”دوسرے ہوئے لوگ“ بھی فساد کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے ہیں جن میں موضوع کو سلیقے سے بیان کرنے اور کہانی کو خوبصورتی سے برتنے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ ”زعفرانی تعاقب“ بھی ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے عمدہ افسانہ ہے حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے ان کے افسانے قارئین کے ذہن و دل پر ضرب لگاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

نذیر احمد یوسفی کی طرح مشتاق اعظمی بھی آسنسول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں بچوں کی کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ بعد ازاں بڑوں کے لیے افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”آدھا آدمی“ کے نام سے ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آچکا ہے اس میں شامل افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کے افسانے عام ڈگریپر ٹیکن دلیچپی اور تجسس کی فضا میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اکثر افسانوں کے اختتام پر قاری کو چوکاتے ہیں اور ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ کلائمکس، آدھا آدمی، وہ مر گیا اور فیوز وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ مشتاق اعظمی کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو شعوری طور پر کسی تحریک سے جوڑنا نہیں چاہتے۔ افسانوں کے ماحول اور فضا سے انصاف کرنا اپنا فرائض سمجھتے ہیں۔ حقیقت بیانی پر زور صرف کرتے ہیں لیکن سپاٹ لہجے کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں کی ذہنی کشمکش کی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے۔ ”رول نمبر ۷۷“ اور ”فیوز“ ان کے بہترین افسانے ہیں۔ بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی ”تاریخ پارے“ کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد نئے اور جدید افسانوں کے دور میں زمانے کا ساتھ نبھانے والوں میں ضلع ہوڑہ کے تین افسانہ نگاروں کا ذکر بھی آتا ہے جن کے نام نوید ہاشمی، سید البرار اور نور پیکر ہیں۔ نوید ہاشمی کا افسانہ ”نشمہ باز کو“، پہلی بار نئی تکنیک کے ساتھ پیش کیا گیا۔ انہوں نے بعد میں ڈرامے بھی لکھے ان کے ڈراموں کا مجموعہ ”چاند کا داغ“ شائع ہو چکا ہے۔ سید البرار کی کہانی، پس تعمیر، آگم جانی اور جلسے کے محافظ قابل ذکر ہیں۔ ان کی

ایک کہانی ’ملہ بازار‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”یہ سن کر لیسین نے چونکتے ہوئے کہا سنبل بائی اور ہاتھی کا کنگھا۔ کیا مطلب؟ دل باغ سنگھ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔۔۔ ہاں بھیا بات ایسی ہے کہ ساوتری کے پاس اس کی نانی کا دیا ہوا ایک کنگھا تھا جس سے وہ اپنے سر کے بال سنوارا کرتی تھی ایک دن آنگن میں بیٹھ کر وہ اپنے بال سنوار رہی تھی، سہ پہر کا وقت تھا نیند کی چھبکی آگئی اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کنگھا بھی غائب تھا اور اس کے سر سے نکلے ہوئے بالوں کی وہ گانٹھ بھی غائب ہے جو اسکے پاؤں کے انگوٹھے کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ پھر جو اسکے بعد سنبل بائی کا روگ لگا تو اب تک اس سے چھکارا نہیں ملا۔ وید، ڈاکٹر، سنت، حکیم، فقیر، کوئی بھی اس کو ٹھیک نہیں کر سکا اور ساوتری بار بار یہی کہتی ہے کہ اگر ہاتھی دانت کا کنگھا مل جائے تو یہ روگ دور ہو جائے گا لیکن بازار میں جدھر دیکھو سانچے میں ڈھلے ہوئے پلاسٹک کے کنگھے بک رہے ہیں۔“ (۲۱)

قیصر شمیم نے رائٹرز ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈالی تو یہاں منعقد ہونے والی نشستوں میں شاعری کے علاوہ نثر کی مختلف اصناف کو خاص طور سے فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ یہاں سے ابھرنے والے ادیبوں اور شاعروں میں نور پیکر شامل ہیں۔ انہوں نے متعدد افسانے لکھے جن میں ’گوتم کابت‘، ’کو بہت سراہا گیا۔ ان کی کہانی ’دھند‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”ممکن ہے کسی دوسری گلی میں آگیا ہوں۔ سب گلیاں تو یکساں ہی ہیں۔ گھر دروازے سب ایک طرح، رنگ و روغن بھی یکساں، کوارٹر نما مکان میں رہنا بھی بڑا فن ہے، ذرا سی غلطی ایک دوسرے گھر میں پہنچا دے گی۔ یہاں ہر قدم ناپ تول کر اٹھانا پڑتا ہے۔ ذہن کو حاضر رکھنا پڑتا ہے۔ ہر لمحہ غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ پورے شہر میں بے فکر ہو کر دوڑتے بھاگتے رہے لیکن گھر پہنچتے ہی چھٹی حس کو بیدار کر لینا پڑتا ہے اکثر ہوتا ہے کہ کوئی اپنا گھر سمجھ کر دوسرے کے گھر کی بیل بجا کر اطمینان سے کھڑا ہے کہ بیگم دروازہ کھول کر خوش آمدید کہیں گی لیکن دوسرے ہی لمحے کوئی دوسری عورت سامنے کھڑی سوالیہ نشان بن جاتی ہے تو اس شخص کی زبان سے صرف ’سوری‘ نکل جاتا ہے۔“ (۲۲)

رائٹرز ایسوسی ایشن سے وابستہ اشہر ہاشمی نے بھی کئی اچھے افسانے لکھے ہیں جن میں ”ایک دائرے کا قیدی“، ”نئی صبح کی پہلی کرن“، ”بابو گاڑی“ اور ”اجنبی“ وغیرہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ”بابو گاڑی“ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”میں اُلجھن میں ہوں کہ خصوصی رعایت کا فائدہ اٹھانا درست بھی ہو گا یا ایک ایسی بات جس کے لیے میں خود کو گنہگار سمجھوں۔ بابو گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی ہے۔ بابو گاڑی آگے بڑھ رہی ہے۔ بابو گاڑی قریب آرہی ہے اور میں سوچ کی گتھیوں میں اُلجھا ہوں۔ ٹرین بڑھ رہی ہے میں سوچ رہا ہوں ٹرین قریب آرہی ہے، میں سوچ رہا ہوں۔۔۔۔“ (۲۳)

مغربی بنگال کی خاتون افسانہ نگاروں میں کہکشاں پروین کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ضلع پرولیا میں مقیم ہیں۔ مغربی بنگال اور بیرون مغربی بنگال کے رسائل و جرائد میں ان کے افسانے گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”ایک مٹھی دھوپ“ ۱۹۸۶ء میں ملت آرٹ پریس پٹنہ سے شائع ہوا۔ کہکشاں پروین کی کہانیوں میں کہانی پن بھی ہے اور نیا پن بھی۔ ان کے سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی فرماتے ہیں:

”کہکشاں پروین کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ وہ مسائل ان کی نگاہوں میں ہیں جو ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ایک حساس

فکار کی طرح ان کے بارے میں اپنا موقف رکھتی ہیں اور اس پس منظر میں افسانے کی تخلیق کرتی ہیں، لہذا ان کے افسانے محض تفریح کا سامان نہیں بلکہ ہماری بصیرت کا موجب بھی ہیں۔ ان کے افسانے اختتام پر فکر کی ایک دنیا آباد کر دیتے ہیں اور ہم ان مسائل پر از سر نو غور کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں۔“^{۲۴}

کہکشاں پروین کے افسانوں میں شیشے کا گھر، گرم چھاؤں، گمشدہ احساس، ایک مٹھی دھوپ، گرتی ہوئی عمارت اور ناگ دیوتا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مصنفہ کے یہاں ندرت بھی ہے اور صفائی بھی۔ وہ گھریلو تنازعے، فرقہ پرستی، قلبی واردات، نفسیاتی گریبیں الغرض ہر قسم کے مسائل کو خوبصورت انداز سے برتنے کا ہنر جانتی ہیں۔ خاتون افسانہ نگاروں میں ساجدہ عندلیب کا نام بھی قابل ذکر ہے اگرچہ اب تک ان کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہو پایا ہے لیکن ان کے افسانے رسائل و جرائد میں کبھی کبھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوں میں وہ کرافٹ پر زور دیتی ہیں شناخت، بامنی، اس کی مثالیں ہیں۔ ”خواہشیں ایسی کہ۔۔۔“ میں کردار نگاری کی صلاحیت نظر آتی ہے۔

عشرت بیتاب (یکم جنوری ۱۹۵۲ء، شیخ پورہ، مونگیر) کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء سے لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلا افسانہ ’لاش پر محل‘ کے نام سے ’شکیلہ‘ بمبئی میں شائع ہوا۔ ’ٹھنڈی آنچ کا کرب‘ ان کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا۔ افسانوں میں جدید دور کے پر آشوب حالات کا ذکر عموماً علامتی اور تجریدی انداز میں کرتے ہیں، لیکن کہانی پن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”بے ثمر حیات“ بھی شائع ہو کر خواص و عوام سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ تحقیقی کام پر بھی نظر ہے۔ تحقیقی کتاب ”مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر“ ان کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

مشتاق انجم (راقم الحروف ۱۳ اگست ۱۹۵۵ء، ہوڑہ مغربی بنگال) بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ”بے گھری“ کے نام سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۲۰۰۰ء میں دوسرا مجموعہ ’تلاش‘ کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہندی لپی میں ’اندھی کھڑکی‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بقول سالک لکھنوی:

”مشتاق انجم کے ہر افسانے کا موضوع انسان ہے جو آج کے ماحول، معاشرے اور سیاست میں غلطان دکھائی دیتا ہے۔ افسانوں میں رمزیت، علامت نگاری، استعاریت، طنز کے تیر اور استہزا کی چوٹ سبھوں سے کام لیا ہے شاعری کی طرف بھی مشتاق انجم مائل نظر آتے ہیں۔“^{۲۵}

جلیل عشرت کے دو افسانوی مجموعے ’اکیسویں صدی کا گوتم‘ اور ’نئی صدی کی بیٹی‘ شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے روایتی افسانوں کے ساتھ ساتھ جدید افسانے بھی لکھے ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعہ ’نئی صدی کی بیٹی‘ میں شامل افسانوں میں ان کے فن پر ایک نوع کا نکھار نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۲۴ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے حقیقت نگاری سے عبارت ہیں۔ ژولیدہ بیانی یا خواہ مخواہ کی تجریدیت سے دور رہتے ہیں۔ کرائے کی دھوپ، نئی صدی کی بیٹی، ساحل سیپ، سمندر وغیرہ ان کے بہترین افسانے ہیں۔ وہ عام طور سے سیاسی اور سماجی مسائل سے افسانوں کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور تقریباً ہر کہانی کے اختتام پر قاری کے لیے کوئی سوال چھوڑ دیتے ہیں۔ شوکت عظیم بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے بہت جلد ترجمہ نگاری کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

”انسانیت زندہ ہے“ اور ”کرسی نامہ“ اُن کے تراجم کی مشہور کتابیں ہیں۔ انہوں نے طبع زاد کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جنازہ، روشنی کی لکیر، ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔

شبیر اختر کے افسانوں کا مجموعہ ’سنان جنگلوں کا راستہ‘ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے مزاج کا میلان جدیدیت کی طرف ہے۔ اپنے افسانوں میں موقع محل کے مطابق علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ان کے افسانوں کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

”ان کہانیوں میں تاثراتی افسانوں کا معیار بھی برقرار رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کہانیوں کا چاؤ، کردار نگاری اور ماحولیاتی سحر بیانی بھی قاری کی حسیاتی جبلت کو تسکین فراہم کرتے ہیں۔ سنان جنگلوں کا راستہ، میں شامل افسانے اپنے اسلوب بیان، رومانی مزاج، جمالیاتی احساسات اور ذاتی تاثرات کے ذریعے اپنی علیحدہ شناخت مستحکم کرتے ہیں۔ کردار نگاری کے ضمن میں جہاں ”معصوم مسکراہٹ“، ”تخفہ“ اور ”بوچھ“ جیسے خوبصورت افسانے ملتے ہیں وہاں ”جگ اندھیر ہی رہا“ اور ”تصور کی تلخی“ جیسے تاثراتی افسانے بھی مجموعے میں موجود ہیں۔“ (۲۶)

شبیر اصغر (۴ فروری ۱۹۶۶ء، نوادہ، بہار کا افسانوی مجموعہ ’الف‘ کے نام سے ۱۹۹۹ء میں ہوڑہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل ’چھپاک‘ اور ’روشنی کا مینار‘ ان کے بہترین افسانے ہیں۔ وہ غیر ضروری علامت نگاری سے بچ کر بیانیہ کی ڈگر پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ’چھپاک‘ میں غربت کے سبب تنگ مکانوں میں رہنے والے افراد کی زندگی کی چھین متاثر کرتی ہے۔ ’بسم اللہ کا گنبد‘ میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ دین کے راستے پر چلنے کے لیے کبھی کبھی بحالت مجبوری غیر دینی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ اس دور کا المیہ ہے ’خوشی کا کرب‘ ایک عورت کی آسودگی اور نا آسودگی کے درمیان پیچ و تاب کی ایک دلزدہ مثال ہے۔ شبیر اصغر کے افسانوں میں متنوع موضوعات نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن کی اشاعت ’امنگ‘ اور ’نرالی دنیا‘ میں وقفاً فوقاً ہوتی رہتی ہے۔

جواں سال افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام انیس النبی کا بھی ہے۔ اگرچہ یہ کم کم لکھتے ہیں لیکن ان کے یہاں تکنیک کے تجربے اور اسلوب کی جدت نمایاں ہے۔ بساط، فرعون، کہانی سنو گے؟ اور پرندہ ان کے پر اثر افسانے ہیں۔ اب تک ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے لیکن رسائل و جرائد میں ان کی شمولیت نظر آتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں داستانوی انداز بیان نظر آتا ہے۔ وہ روایات و اساطیر سے دور حاضر کا رشتہ استوار کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ”کہانی سنو گے؟“ اور ”پرندہ“ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

آسنسول کے جواں سال افسانہ نگار سلیم سرفراز کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’خواب کنارے‘ ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ جس کا پہلا افسانہ ’سعی لا حاصل‘ جبر و استبداد کے خلاف ایک مکمل احتجاج کی صورت نظر آتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ’خواب کنارے‘ دلچسپی اور تاثر سے بھرپور ہے۔ ’اپنی جڑوں کی جانب‘ کو جذبات سے مملو اور عبرت ناک افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ افسانہ ’دینا ناتھ‘ بھی مذہب کی بنیاد کو کمزور کرنے والوں کے خلاف ایک پُر اثر احتجاج ہے یہ رواداری اور مساوات پر مبنی ایک سبق آموز اشاریہ بھی ہے۔

سلیم سرفراز نے نئی تکنیک اور تجربے کی راہ پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ’مکالا قانون‘ اس سلسلے کا دلچسپ اور کامیاب افسانہ ہے۔ جہاں قانون کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی دانستہ تحریک نظر آتی ہے۔ سلیم سرفراز نے اس تحریک کا احاطہ کرتے ہوئے بیرون ملک کے ماحول کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

علاوہ ازیں سعیداعظمی (سمجھوتہ، مورکھ)، شاہد فروغی (آنکھیں سڑک پر)، سلیم خان ہمراز (ڈیڈ لائن، پتلیوں میں پگھلتا سورج)، شہلایا سمین (تصویر سچ بولتی ہے)، شہزاد (مڈل کلاس)، خورشید اختر فرازی (اپنے پاس کیا امانوں کے سوا)، ارشد نیاز (امیر حمزہ) وغیرہ بھی آج کل باقاعدگی سے افسانے لکھ رہے ہیں اور مختلف رسائل و جرائد میں ان کی اشاعت بھی ہو رہی ہے۔

دورِ حاضر میں مغربی بنگال میں لکھے جانے والے افسانوں کا مطالعہ اس بات کو تقویت پہنچاتا ہے کہ یہاں کے افسانہ نگاروں کے فکرو فن میں کافی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے سوچنے کے انداز میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور اندازِ بیان میں بھی ندرت کا احساس ہو رہا ہے۔ مجموعی طور پر صورت حال امید افزا ہے۔

حوالہ جات

1. محمد نظام الدین، سہ ماہی روح ادب (کلکتہ) مغربی بنگال کا اردو ادب نمبر، اردو اکاڈمی، مغربی بنگال، ۱۹۹۵ء، ص ۷۱
2. ایضاً، ص ۷۲
3. ایم حبیب خان، انشاء اللہ خان انشاء، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۷۰، ۷۱
4. محمد نظام الدین، سہ ماہی روح ادب (کلکتہ) مغربی بنگال کا اردو ادب نمبر، اردو اکاڈمی، مغربی بنگال، ۱۹۹۵ء، ص ۷۷
5. ایضاً، ص ۶۰
6. سالک لکھنوی، مغربی بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۱
7. عشرت بیٹاب، مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر، نواز پبلی کیشنز، آسنسول، ۱۹۸۲ء، ص ۲۲
8. ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، راحت آرابیگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے، ناشر مصنفہ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۵
9. سالک لکھنوی، مغربی بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ۲۰۰۰ء، ص ۳۶
10. محمد نظام الدین، سہ ماہی روح ادب کلکتہ، جنوری تا جون ۱۹۹۵ء، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، ص ۱۱۶
11. جوہر غازی پوری، باغیانہ افسانے، ادارہ ایوان اردو، ہوڑہ، ۱۹۵۲ء، ص ۷
12. ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، راحت آرابیگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے، ناشر مصنفہ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۵
13. سالک لکھنوی، مغربی بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۶
14. ایضاً، ص ۲۲۷
15. ایضاً، ص ۲۲۵-۲۳۰
16. ایضاً، ص ۲۴۱
17. عشرت بیٹاب، مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر، نواز پبلی کیشنز، آسنسول، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴
18. ایضاً، ص ۵۲
19. ایضاً، ص ۵۸
20. نذیر احمد یوسفی، چپ فضا میں عذاب، کیلی گراف آفسیٹ پرنٹرز، کلکتہ، ۱۹۹۳ء، ص ۸
21. مشتاق انجم، ہوڑہ میں اردو افسانے کا سفر، ہفتہ وار نئی صدی، کلکتہ، نوشاد مومن شمارہ، ۲۳ جون ۲۰۰۲ء، ص ۷

22. ایضاً
23. ایضاً
24. کہکشاں پروین، ایک مٹھی دھوپ، ملت آرٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۸۶ء، وہاب اشرفی، آخری صفحہ کے اندر کافلیپ
25. سالک لکھنوی، مغربی بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۰
26. شبیر اختر، سنان جنگوں کا راستہ، مکتبہ دین وادب، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۹

References

1. Mohammad Nizamuddin, Quarterly Rooh Adab (Calcutta) Urdu Adab No. of West Bengal, Urdu Academy, West Bengal, 1995, p. 71
2. Ibid. p. 72
3. M. Habib Khan, Inshallah Khan Insha, Sahitya Akademi, New Delhi, 1989, pp. 71,70
4. Mohammad Nizamuddin, Quarterly Rooh Adab (Calcutta) Urdu Adab No. of West Bengal, Urdu Academy, West Bengal, 1995, p. 77
5. Ibid. p. 60
6. Salik Lakhnavi, History of Urdu Prose in West Bengal, West Bengal Urdu Academy, Calcutta, 1998, p. 201
7. Ishrat Betaab, The Journey of Urdu Fiction in West Bengal, Nawaz Piliations, Asansol, 1982, p. 22
8. Dr. Fehmida Begum, Rahat Ara Begum's Fiction and Selected Fiction, Publisher, New Delhi, 1993, p.5
9. Salik Lakhnavi, History of Urdu Prose in West Bengal, West Bengal Urdu Academy, Calcutta, 2000, p. 36
10. Mohammad Nizamuddin, Quarterly Rooh Adab Calcutta, January-June 1995, West Bengal Urdu Academy, p. 116
11. Jo Har Ghazi Puri, Rebellious Fiction, Adara Iwan Urdu, Hozah, 1952, p. 7
12. Dr. Fehmida Begum, Rahat Ara Begum's Fiction and Selected Fiction, Publisher, New Delhi, 1993, p. 5
13. Salik Lakhnavi, History of Urdu Prose in West Bengal, West Bengal Urdu Academy, Calcutta, 1998, p. 226
14. Ibid. p. 227
15. Ibid., p. 225. 230
16. Ibid. p. 241
17. Ishrat Betaab, The Journey of Urdu Fiction in West Bengal, Nawaz Piliations, Asansol, 1982, p. 14
18. Ibid. p. 52
19. Ibid., p. 58
20. Nazir Ahmed Yusufi, Torment in the Silent Atmosphere, Kelly Graph Offset Printers, Calcutta, 1993, p. 8
21. Mushtaq Anjum, The Journey of Urdu Fiction in Howrah, Weekly New Century, Calcutta, Naushad Momin Issue, June 23, 2002, p. 7
22. edict
23. edict
24. Galaxy Parveen, A Handful of Sunglasses, Laced with Millat Art, Patna, 1986, Wahab Ashrafi, last page inside flap
25. Salik Lakhnavi, History of Urdu Prose in West Bengal, West Bengal Urdu Academy, Calcutta, 1998, p. 370
26. Shabbir Akhtar, The Path of Deserted Wars, Maktaba Din wa Adab, Lucknow, 1990, p. 9